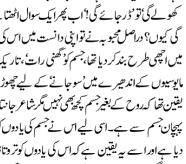

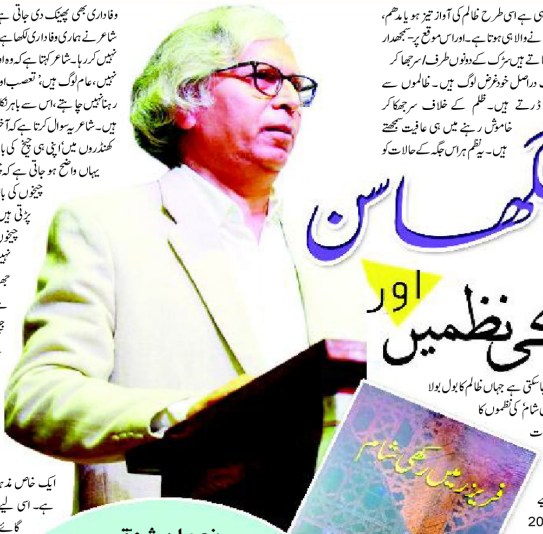

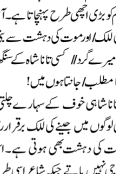

تاناشاہ کا سنگھاسن اور نعمان شوق کی نظمیں

نعمان شوق کی نظمیں حالات کی تبدیلیوں کی نظمیں ہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ دو دہائی قبل نعمان شوق نے حالات کی متوقع تبدیلیوں کو بھانپ لیا تھا۔ اسی لیے دنیا کے موجودہ حالات کو دیکھ کر یہی لگتا ہے کہ 'فریزر میں رکھی شام' کی نظمیں اسی دور، اسی وقت کی ہیں، شاعر نے حالات کو سوچا نہیں ہے، حالات کو دیکھا اور لکھ دیا ہے یعنی نظموں کے تحریر کرنے کا وقت تو ماضی بن گیا لیکن نظمیں حال میں داخل ہو گئیں۔

خاور حسن

شاعر حساس ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر شاعر اتنا ہی دور اندیش ہو کہ وہ 'مگس کو باغ میں جانے سے روکنے کے لیے کہے تاکہ 'ناحق خون' پروانے کا نہ ہو۔ ہر شاعر کے پاس بات کہنے کے لیے مناسب الفاظ ہوتے ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ ان کا برمحل استعمال کر لے جبکہ پرانے الفاظ کا استعمال بھی نئے طریقے سے کیا جا سکتا ہے جیسے 'فریز' نیا لفظ نہیں، 'شام' بھی برس چند برس پرانا لفظ نہیں ہے، 'فریز' اور 'شام' کا باہم کوئی تعلق بھی نہیں ہے مگر ان دو الفاظ کے استعمال سے مشہور شاعر نعمان شوق نے اپنی نظم کا عنوان 'فریز ر میں رکھی شام' بنایا ہے۔ یہ ان کی نظموں کے مجموعے کا نام بھی ہے۔ یہ مجموعہ کافی مقبول ہوا۔ کتاب کے نام سے قارئین کی جو دلچسپی پیدا ہوتی ہے، وہ اس کی آخری نظم کی آخری لائنوں تک برقرار رہتی ہے۔ نام پڑھتے ہی ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ 'فریز ر میں رکھی شام' سے شاعر کا مطلب کیا ہے؟ وہ کہنا کیا چاہتا ہے؟ یہ بات ناقابل فہم نہیں کہ 'فریز' میں کوئی چیز اس لیے رکھی جاتی ہے تاکہ وہ منجمد مگر جوں کی توں رہے۔ شاعر کی روح کو تو 'کالے تابوت' میں رکھ کر 'کیلیں ٹھونک' دی گئی ہیں اور اس کے جسم کو 'گھنی رات کے جنگل میں سو جانے' کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے مگر شاعر خود ہی 'تن کے ٹکڑے کر کے لفظوں کے صندوق میں بھر کر بیتے دنوں کے فریز ر میں رکھ آیا' ہے۔ اسے یہ یقین ہے کہ محبوبہ جب 'گزری شاموں کے پٹ کھولے گی' تو 'ڈر جائے گی'! اب پھر ایک سوال اٹھتا ہے کہ وہ ڈرے گی کیوں؟ دراصل محبوبہ نے تو اپنی دانست میں اس کی روح کو تابوت میں اچھی طرح بند کر دیا تھا، جسم کو 'گھنی رات'، تاریک ترین رات یا مایوسیوں کے اندھیرے میں 'سو جانے' کے لیے چھوڑ دیا تھا، اسے یہ یقین تھا کہ روح کے بغیر جسم کچھ بھی نہیں مگر شاعر جانتا ہے کہ روح کی پہچان جسم سے ہے۔ اسی لیے اس نے جسم کی یادوں کو فریز ر میں رکھ دیا ہے اور اسے یہ یقین ہے کہ اس کی یادوں کو تر و تازہ دیکھ کر وہ ڈر جائے گی۔ یہاں روح خواہش کا استعارہ ہے اور جسم یادوں کا۔

نعمان شوق کی نظمیں پڑھنے میں اچھی لگتی ہیں۔ ان نظموں کو سمجھنے کے لیے ذہن پر کچھ زور ڈالنا پڑتا ہے مگر سمجھ میں آنے لگتی ہیں تو پھر آتی ہی چلی جاتی ہیں، البتہ انہیں سمجھانا آسان نہیں۔ نظم 'مکھیہ دھارا میں' کی یہ لائنیں دیکھئے- صدیوں پہلے/ چار بیویاں رکھنے کی اجازت سے بنی/ قدیم، غیر حقیقی چارپائی پر ہم/ کانپ رہے ہیں ڈر سے/ یا ہم بستری کر رہے ہیں/ کاش سمجھ پاتے آپ!

شاعر نے یہ اشارہ دینے کی کوشش کی ہے کہ چار بیویاں رکھنے کی اجازت تو ہے، اس کی وجہ سے ایک قوم کو بدنام کرنے کی روایت بھی قدیم ہے مگر چارپائی ہی 'غیر حقیقی' ہے، پھر اس پر حالات کا خیال کر کے لوگ کانپ رہے ہیں یا ہم بستر ہو رہے ہیں، یہ سمجھنا دراصل حقیقت کو سمجھنا ہے مگر افسوس کہ چار شادی کے مسئلے پر تنقید کرنے والے لوگ یہ حقیقت سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اسی نظم کی یہ لائنیں دیکھئے- کیا فرق ہے/ ہم میں اور آپ میں// پھر بھی/ نہ جانے کیوں ان دنوں/ رندھے ہوئے گلے سے ہی سہی/ چیخنا چاہتے ہیں ہم/ آپ کے میٹھے سپنوں کے سرہانے بیٹھ کر/ گانا چاہتے ہیں کوئی دکھ بھرا گیت/ پو پھٹنے تک

ایک حد سے زیادہ جذباتی ہو جانے پر گلا رندھ جاتا ہے اور شاعر جذباتی اس لیے ہے کہ حالات کچھ ہیں، دکھائے کچھ اور جا رہے ہیں۔ وہ پو پھٹنے، یعنی ستم کی رات گزر جانے، امید کی صبح ہو جانے تک دکھ بھرا گیت گانا چاہتا ہے۔ اسے 'میٹھے سپنے' دکھائے جا رہے ہیں جبکہ وہ حالات سے واقف ہے، ان سپنوں کی حقیقت سے بھی واقف ہے۔ وہ چیخنا چاہتا ہے کہ میٹھے سپنے مت دکھاؤ، حالات کی مناسبت سے جینے دو، حالات کا رونا رو لینے دو مگر اس کی بے بسی کی انتہا یہ ہے کہ اسے چیخنے کی بھی اجازت نہیں۔ اسی لیے اسے کہنا پڑتا ہے- کیا ہمیں اپنے وجود کے بکھرتے چھند سے/ کوئی دھن، کوئی لے بننے کی/ اجازت دیں گے آپ!

نعمان شوق کی نظمیں حالات کی تبدیلیوں کی نظمیں ہیں۔ حالات کی تبدیلیوں پر اردو کے دیگر شعرا نے بھی اشعار کہے ہیں۔ کئی شعرا نے غزلوں میں بدلتے حالات پر ایک دو شعر کہے ہیں۔ نعمان شوق نے بھی غزلوں میں بدلتے حالات پر اشعار کہے ہیں لیکن حالات کی تبدیلیوں پر جس طرح باضابطہ طور پر اور مسلسل نعمان شوق نے نظمیں لکھی ہیں، اردو کے کسی اور شاعر نے نہیں لکھیں۔ حالات کی تبدیلیوں پر لکھنے کے لیے نعمان نے غزلوں کے بجائے نظموں کا انتخاب کیا، کیونکہ غزلیں متفرق اشعار پر مشتمل ہوتی ہیں جبکہ نظموں میں واقعات کا بیان تسلسل سے کرنے کی یا بات تسلسل سے کہنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ دو دہائی قبل نعمان شوق نے حالات کی متوقع تبدیلیوں کو بھانپ لیا تھا۔ اسی لیے دنیا کے موجودہ حالات کو دیکھ کر یہی لگتا ہے کہ یہ شاعری اسی دور، اسی وقت کی ہے، شاعر نے حالات کو سوچا نہیں ہے، حالات کو دیکھا اور لکھ دیا ہے۔ نظم 'سڑک کے دونوں طرف خیریت ہے' میں نعمان شوق لکھتے ہیں- آسمان کے ایک کنارے سے/ دوسرے کنارے تک اڑ رہی ہے/ رنگ برنگی موت

پہلی دو لائنیں سمجھانے کی ضرورت نہیں، البتہ یہ سمجھنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ موت تو موت ہوتی ہے، شاعر نے پھر 'رنگ برنگی موت' کیوں لکھا؟ لیکن کہیں گردن پر گھٹنا رکھ کر سینے میں دم گھونٹ دینے، کہیں چلتی ٹرین میں بحث کا جواب گولیوں سے دینے، کہیں بے قصور بچوں پر بمباری اور ہزاروں ٹن ملبے کو ان کی وسیع ترین قبر بنا دینے، کہیں کسی وجہ سے بھیڑ کے اجتماعی قاتلوں میں تبدیل ہو جانے اور ایک نہتے انسان کو پیٹ پیٹ کر مار ڈالنے کے واقعات کو دیکھتے ہوئے یہ بات ناقابل فہم نہیں رہ جاتی کہ موت بھی 'رنگ برنگی' ہوتی ہے۔ نظم کی متذکرہ لائنوں میں سے آخری لائن کے ساتھ آگے کی لائنیں اس طرح ہیں- رنگ برنگی موت/ پتنگوں کی طرح بل کھاتی ہوئی/ جس کی ڈور/ گلی کے منچلے لڑکوں کے ہاتھوں میں ہے

یہاں 'منچلے لڑکوں' سے مراد غیر حساس اور ظالم لوگ ہیں جو کسی کی جان کی ڈور کو اسی طرح اپنے ہاتھوں میں سمجھتے ہیں جیسے پتنگوں کی ڈور کو۔ نظم کی آگے کی لائنیں ہیں- بکھرتے چاند کی/ ادھ جلی پرچھائیں سے بنے رتھ پر سوار/ جھومتے ہوئے آتے ہیں آوارہ کتے/ جو بھونکتے ہیں/ کبھی دھیمی اور کبھی تیز آواز میں

یہاں چاند امید کا استعارہ ہے اور چاند کا بکھرنا امید کا بکھرنا ہے۔ اس امید کا نصف حصہ جو جل گیا ہے، جو مایوسی میں بدل گیا ہے، یہی مایوسی کمیوں کے لیے رتھ بن گئی ہے اور اس پر سوار ہیں آوارہ کتے۔ وہ بھونکتے ہیں- کبھی دھیمی آواز میں، کبھی تیز آواز میں- یہاں کتا ظالم کا استعارہ ہے۔ جیسے کتے کی آواز تیز ہو یا مدھم، ہمیشہ بھونکتا ہی ہے اسی طرح ظالم کی آواز تیز ہو یا مدھم، اس کا لہجہ ہمیشہ دھمکانے والا ہی ہوتا ہے۔ اور اس موقع پر- سمجھدار لوگ/ کھڑے ہو جاتے ہیں سڑک کے دونوں طرف/ سر جھکا کر

یہ سمجھدار لوگ دراصل خود غرض لوگ ہیں۔ ظالموں سے ڈرتے ہیں۔ ظلم کے خلاف سر جھکا کر خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ یہ نظم ہر اس جگہ کے حالات کو پیش نظر رکھ کر سمجھی جا سکتی ہے جہاں ظالم کا بول بولا ہے۔ 'فریز ر میں رکھی شام' کی نظموں کا موازنہ آج کے حالات سے کرتے وقت یہ بات نظر انداز نہیں کی جانی چاہیے کہ یہ کتاب 2004 میں شائع ہوئی تھی۔ نعمان شوق نے حالات کی تبدیلیوں کو دو دہائی قبل ہی سمجھ لیا تھا۔ اسی لیے ان نظموں کی زمانی اہمیت برقرار ہے۔

'ڈوبتی ناؤ پر' اس کتاب کی ایک مختصر سی نظم ہے۔ یہ معنوی سطح پر اتنی وسعت رکھتی ہے کہ جو باتیں ایک مضمون میں کہنے کی تھیں، نعمان شوق نے انہیں آٹھ لائنوں میں کہہ دیا ہے۔ نظم ہے- نظریات کی سیڑھیوں کے نیچے/ کھدائی جاری ہے// پوری طاقت سے پکڑے رہیے/ اپنے اپنے ملک، مذہب/ اور عقیدے کے سانپوں کی دم/ جیسے پکڑے رہتے ہیں/ ڈوبتی ناؤ پر سوار لوگ/ ایک دوسرے کو!

آثار قدیمہ کے مقامات میں کھدائی تاریخی حقائق جاننے کے لیے کی جاتی ہے، خیال کی حقیقت جاننے کے لیے کی جاتی ہے، نظریات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بھی کی جاتی ہے مگر اس کھدائی کے کیا نتائج سامنے آئیں گے، اس پر کوئی بولنے والا نہیں۔ سب نے ملک، مذہب اور عقیدے کے سانپوں کی دم کو پکڑ رکھا ہے اور ان کے منہ کو ڈسنے کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔ وہ یہ دیکھ ہی نہیں پا رہے ہیں کہ یہ سانپ انسانیت کو ڈس رہے ہیں، شاعر نے اسی صورتحال کا موازنہ اس ڈوبتی ہوئی کشتی سے کیا ہے جس پر سوار لوگ ایک دوسرے کو پکڑے رہتے ہیں، وہ اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ اس طرح بچ جائیں گے جبکہ کشتی ہی ڈوب جائے گی تو پھر وہ کہاں بچ پائیں گے۔ اسی طرح انسانیت ہی نہیں رہے گی، پھر انسان کہاں رہیں گے۔ نظم ہے 'مسخروں کے درمیان'- نام نہاد جمہوریت کے/ عظیم الشان بوچڑ خانے میں/ گھس آئے ہیں/ بھیڑیوں کے غول// باہر کھڑے دانشور، صحافی/ اور اپنی چمکتی چھاتیوں پر/ انصاف کے تمغے سجائے لوگ/ لطیفے سنا رہے ہیں ایک دوسرے کو/ اور سن رہے ہیں/ چپڑ... چپڑ... کا شور!

شاعر نے 'نام نہاد' لکھ کر یہ بات واضح کر دی ہے کہ وہ اصل جمہوریت کی باتیں نہیں کر رہا۔ اس نے آگے جو بھی لکھا ہے، وہ اصل جمہوریت میں نہیں، نام نہاد جمہوریت میں ہوتا ہے۔ ایسی جمہوریت جہاں انسان نما بھیڑیے ہرنوں جیسے معصوم لوگوں کا شکار کرتے ہوں، شاعر کے لیے وہ 'بوچڑ خانہ' ہی ہے۔ 'بوچڑ خانہ' کے ساتھ 'عظیم الشان' کا استعمال شاعر کا طنز ہے۔ شاعر کے مطابق، یہ حالت اس لیے ہے کہ دانشور، صحافی اور 'اپنی چمکتی چھاتیوں پر انصاف کے تمغے سجائے لوگ' تو ہیں مگر بے حس اور بے ضمیر ہیں۔ انہیں یہ فکر نہیں کہ بھیڑیوں نے ان کے جمہوریہ کو 'ایک عظیم الشان بوچڑ خانے' میں تبدیل کر دیا ہے۔ انسان نما بھیڑیوں کے بے قصور اور معصوم لوگوں پر مظالم کا شور انہیں سنائی دیتا ہے مگر وہ مست ہیں۔ 'چپڑ... چپڑ... کا شور' دراصل مظالم کا شور ہے اور شاعر نے اس شور سے دانشور، صحافی اور نام نہاد انصاف پسند لوگوں کی بے پروائی دکھانے کے لیے 'لطیفہ سننے' اور 'سنانے' کی بات کہی ہے۔

نظم ہے 'کچھ نئی آوازیں پرانے قبرستان سے'- مکھی کی طرح پڑی ہے/ آپ کی چائے کی پیالی میں/ ہماری وفاداری// ہم جو بابر کی اولاد نہیں/ باہر نکلنا چاہتے ہیں/ تعصب اور ریاکاری کے اس مقبرے سے// آخر کب تک سنتے رہیں گے ہم/ تاریخ کے جھوٹے کھنڈروں میں/ اپنی ہی چیخ کی بازگشت// آپ جو بانسری بجا رہے ہیں/ جمہوریت نما گائے کی پیٹھ پر بیٹھے/ شہر کے سب سے پرانے قبرستان سے/ اٹھتی یہ آوازیں/ سنائی دے رہی ہیں آپ کو!

قبرستان پرانا ہے، آوازیں نئی ہیں- نئے مردوں کی آوازیں۔ یہ آوازیں پرانے قبرستان سے ہی کیوں آتی ہیں؟ اب نظم شروع کرتے ہیں تاکہ عنوان سمجھ میں آ جائے۔ شاعر ان لوگوں سے مخاطب ہے جن کے لیے اس کے جیسے لوگوں کی وفاداری اس مکھی کی طرح ہے جو چائے کی پیالی میں پڑی ہوئی ہے اور جیسے مکھی پیالی سے نکال کر پھینک دی جاتی ہے، ان کی وفاداری بھی پھینک دی جاتی ہے، اس کا کوئی مول نہیں۔ یہاں شاعر نے ہماری وفاداری لکھا ہے۔ مطلب یہ کہ شاعر تنہا اپنی بات نہیں کر رہا۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ اور اس کے جیسے لوگ بابر کی اولاد نہیں، عام لوگ ہیں، 'تعصب اور ریاکاری کے مقبرے' میں مقید رہنا نہیں چاہتے، اس سے باہر نکلنا چاہتے ہیں مگر نکل نہیں پا رہے ہیں۔ شاعر یہ سوال کرتا ہے کہ آخر کب تک وہ 'تاریخ کے جھوٹے کھنڈروں میں' اپنی ہی چیخ کی بازگشت سنتے رہیں گے؟ یہ بات یہاں واضح ہو جاتی ہے کہ چیخوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اپنی چیخوں کی بازگشت خود چیخنے والوں کو ہی سننی پڑتی ہیں، کیونکہ کوئی اور سننے والا نہیں۔ چیخوں کا یہ سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک 'تاریخ کے جھوٹے کھنڈروں' کا وجود برقرار ہے۔ اسی لیے شاعر اور اس کے جیسے لوگ 'تعصب اور ریاکاری کے مقبرے' سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔

انگریزی میں معصومیت کا استعارہ میمنہ (Lamb) ہے، ہمارے یہاں گائے ہے۔ یہ تقدس اور ایک خاص مذہب سے وابستگی کا استعارہ بھی ہے۔ اسی لیے شاعر کہتا ہے کہ 'جمہوریت نما گائے کی پیٹھ پر بیٹھ کر' بانسری بجائی جا رہی ہے مگر 'شہر کے سب سے پرانے قبرستان سے' اٹھتی نئی آوازیں اس بانسری کی حقیقت بیان کر رہی ہیں۔ شاعر چاہتا ہے کہ جمہوریت کی بانسری ہی نہ بجائی جائے، شہر کے پرانے قبرستان سے اٹھتی ہوئی نئی آوازوں کو بھی سنا جائے۔ سمجھا جائے کہ وہ آوازیں کیوں آ رہی ہیں؟ وہ آوازیں پرانے قبرستان سے ہی کیوں آ رہی ہیں؟ کیا اسی لیے کہ ان آوازوں کو وہاں دبانے کی کوشش کی گئی ہے؟ 'پرانے قبرستان' سے مراد پرانا سسٹم ہے، 'نئی آواز' سے مراد نئے جمہوریت پسند لوگ ہیں جن کی آوازیں 'پرانے سسٹم' میں دفن کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر وہ پوری طرح دفن نہ کی جا سکی ہیں، اسی لیے آتی رہتی ہیں۔ 'کچھ نئی آوازیں پرانے قبرستان سے' ایک خاص طرح کی باتوں سے شروع ہوتی ہے مگر آخری بندوں میں اس کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اس میں ہر اس ملک کے حالات کی جھلک نظر آنے لگتی ہے جہاں جمہوریت کی باتیں تو بہت کی جاتی ہیں مگر ہے نام نہاد جمہوریت۔ اسی لیے وہاں کے پرانے سسٹم میں نئے جمہوریت پسند لوگوں کی آوازیں دفن کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔

کیا یہ نظمیں صرف اردو والوں کے لیے ہیں؟ نہیں! اسی لیے 'فریزر میں رکھی شام' کی بیشتر نظمیں پہلے 'ہنس'، 'کتھا دیش'، 'گیانودے' اور 'واگرتھ' جیسے ہندی کے بڑے ادبی رسائل میں شائع ہوئی ہیں۔ کیا یہ نظمیں پرانی ہو گئی ہیں؟ نہیں! یہ نظمیں بیس برس پہلے ضرور لکھی گئی تھیں مگر ہیں نئی۔ ایسا اس لیے ہے کہ نعمان شوق نے حالات کی متوقع تبدیلیوں کو نظر انداز کر کے نظمیں نہیں لکھی ہیں، البتہ یہ ان کی دور اندیشی، حالات پر گہری نظر ہے کہ وہ تبدیلیوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا سکے۔ اسی لیے ان کی نظموں کے تحریر کرنے کا وقت تو ماضی بن گیا، ان کی نظمیں ماضی کا حصہ نہ بن سکیں۔

'لکشمن ریکھا'- یہ پوری نظم پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شاعر کا تیور نظم کے پہلے لفظ 'نہیں!' سے جو شروع ہوتا ہے، آخر تک برقرار رہتا ہے۔ نظم ہر بند کے ساتھ قارئین کے اذہان پر گرفت مضبوط کرتی چلی جاتی ہے۔ آخری بند نظم کا کلائمکس ہے۔ اس سے فوراً پہلے کا بند کلائمکس کی طرف نظم کو بڑی اچھی طرح پہنچاتا ہے۔ آخری دو بند اس طرح ہیں- جینے کی للک/ اور موت کی دہشت سے بنی لکشمن ریکھا/ نہیں کھینچی جا سکتی/ میرے گرد// کسی تاناشاہ کے سنگھاسن پر/ اپنے پاؤں رکھ کر سونے کا مطلب/ جانتا ہوں میں!

تاناشاہ کی تاناشاہی خوف کے سہارے چلتی ہے۔ خوف کے ماحول میں بھی لوگوں میں جینے کی للک برقرار رہتی ہے۔ اس للک کے ساتھ موت کی دہشت بھی ہوتی ہے۔ اس دہشت کی وجہ سے وہ زندگی جی نہیں پاتے جبکہ شاعر اسی طرح زندگی جینا چاہتا ہے جیسے جینا چاہیے۔ زندگی جینے کی للک کے ساتھ موت کی دہشت کی کوئی لکشمن ریکھا میں وہ قید نہیں۔ وہ تاناشاہ سے مرعوب نہیں۔ اسے موت کا خوف نہیں، کیونکہ خوف کے ساتھ زندگی جی نہیں جا سکتی۔ تاناشاہ کے خوف سے خود کو آزاد دکھانے کے لیے ہی شاعر نے یہ لکھا ہے کہ وہ اس کے سنگھاسن پر پاؤں رکھ کر سونے کا مطلب جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ موت تو ایک دن آنی ہی ہے، اس سے پہلے تو زندگی ہی ہے۔

نعمان شوق کی نظموں کو وہ لوگ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں جن کی عالمی حالات پر نظر ہو، جو گزشتہ تین دہائی کی بڑی تبدیلیوں سے واقف ہوں، معنوی تہہ داری کو سمجھ سکتے ہوں اور ذہن پر ذرا زور یہ جاننے کے لیے ڈال سکتے ہوں کہ شاعر آخر کہنا کیا چاہتا ہے؟ نعمان شوق کی نظموں کو پڑھتے ہوئے یہ سمجھنے میں بالکل دشواری نہیں ہوتی کہ 'فریزر میں رکھی شام' کا شاعر بے حس اور غیر حساس نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ انسان ہونے کے لیے انسانیت کا خیال ضروری ہے مگر غیر حساس، خود غرض، متعصب، ریاکار اور ظالم لوگوں کے لیے انسانیت کا کوئی مول نہیں! ■

نعمان شوق کی نظموں کو پڑھتے ہوئے یہ سمجھنے میں بالکل دشواری نہیں ہوتی کہ 'فریزر میں رکھی شام' کا شاعر بے حس اور غیر حساس نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ انسان ہونے کے لیے انسانیت کا خیال ضروری ہے۔

حمد باری تعالیٰ

کروں وصف کیا میں بیاں ترا تری شان جلّ جلالہٗ
تری ذات لائقِ ہر ثنا تری شان جلّ جلالہٗ

تری کارسازی سے آشنا نہ ہوئے پیمبر و اولیاء
ترا بھید کوئی نہ پا سکا تری شان جلّ جلالہٗ

جو مریضِ غم کی کرے دوا دلِ دردمند کو دے شفا
نہیں اور کوئی ترے سوا تری شان جلّ جلالہٗ

تو سکونِ دل تو قرارِ جاں تو معین و حامی بے کساں
تو ہی بے سہاروں کا آسرا تری شان جلّ جلالہٗ

تو رحیم ہے تو کریم ہے تو علیم ہے تو حکیم ہے
مرے دل کو کر دے سکوں عطا تری شان جلّ جلالہٗ

میں گناہ گار ہوں سر بسر مرے حالِ زار پر رحم کر
تری رحمتوں کا ہے آسرا تری شان جلّ جلالہٗ

وہ رسولِ خاتمِ انبیاء شہِ دیں محمد مصطفےٰؐ
ہمیں ایسا راہ نما دیا تری شان جلّ جلالہٗ

ترا بندہ اخترؔ مسلمی ترے در پہ سر بسجود ہے
ہے لبوں پہ اس کے تری ثنا تری شان جلّ جلالہٗ

اخترؔ مسلمی

غزل

ارے ناصح تجھے کیوں بے کلی ہے
ابھی تو میں نے تھوڑی ہی سی پی ہے
کلی کیسی گلوں کو بے کلی ہے
بہت برہم مزاج زندگی ہے
شکایت کی ہے دل میں دل میں کی ہے
مگر تم سے بڑی شرمندگی ہے
خوشی اشکوں کے سانچے میں ڈھلی ہے
غریبوں کی یہی تو زندگی ہے
اندھیرا ہی زمانہ بھر میں ہوتا
محبت کی بدولت روشنی ہے
کبھی تو جام قسمت سے ملے گا
ہماری مئے ہماری تشنگی ہے
بدلتے جا رہے ہیں پینے والے
ہے میخانہ وہی ساقی وہی ہے
ستارے کھو چکے ہیں روشنی کو
ہے کیسا چاند، کیسی چاندنی ہے
سنے اک آنکھ اور اک آنکھ روئے
اسی کا نام تو دیوانگی ہے
سنور جائیں اگر زلفیں تو کیا ہو
بکھرنے میں جب اتنی دلکشی ہے
مئے رنگیں کی رنگینی نہ پوچھ
ارے توبہ کہ توبہ کر کے پی ہے
ہے ساغرؔ میں شراب ارغوانی
کہ اک پیکر میں روح زندگی ہے

ساغرؔ بلرام پوری

Syed Husain Mehdi
Nami Manzil Chowk Balrampur
Pin-271201, Mob. 9559521200

افسانہ

انسانیت

محمد خورشید عالم سیف

وہ اپنے علاقے کا چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ لوگ اس کے نام سے ہی کانپ جاتے تھے۔

وہ کسی کی نہیں سنتا تھا سوائے اپنی ماں کے۔ اس کی ماں اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اور اسی کمزوری کا فائدہ اس کے حریف اٹھا لیتے تھے۔

ایک روز اس کے ہاتھوں ایک شخص کا خون ہو جاتا ہے۔ پولیس اسے اٹھا کر لے جاتی ہے اور لاک اپ میں ڈال دیتی ہے۔ وہ پولیس والوں کو اپنی ماں کی دہائی دیتا ہے کہ اسے محض ایک گھنٹہ کے لئے اسکے گھر جانے دے کیونکہ اس کی گرفتاری کی خبر سن کر اسکی ماں پر غشی طاری ہوتی ہے اور زمین پر گر کر بیہوش ہو جاتی ہے۔ اسے اسکی خبر تب لگتی ہے جب وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔

پولیس والے اس کی اجازت نہیں دیتے ہیں تو وہ دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔ وہ چاہ کر بھی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ قانون کے ہاتھ کافی لمبے ہوتے ہیں۔

عدالت میں پیشی کے بعد اسے عمر قید کی سزا ہو جاتی ہے۔ اس دوران اس کی ماں کا انتقال ہو جاتا ہے۔ ماں کی جدائی کا غم اس کے لئے کسی قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ قید کی صعوبتیں اس کے لئے ماں کو کھونے کے غم سے کہیں کم تھیں۔

جیل کی کال کوٹھری میں جب وہ تنہائی میں ہوتا تو اپنے بارے میں ایک بار ضرور سوچتا کہ آخر وہ ہے کون؟ ہندو ہے یا مسلمان یا اس کا تعلق کسی اور مذہب سے ہے؟

جب اسے یہ تک معلوم نہیں کہ اسے جنم دینے والی ماں کون اور کیسی تھی تو اسے کیسے پتہ چلتا وہ کس دھرم کا ہے؟ اسے صرف اتنا ہی پتا تھا وہ جس گود میں کھیلا کودا ہے وہ ہی اس کا سب کچھ تھی۔ اور یہ کہ جس ماں میں اس کی جان بستی ہے وہ ہی اس کا پالن ہار تھی۔

وہ اپنی ماں کے غم میں اس قدر نڈھال ہو جاتا ہے کہ اسے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں رہتی۔ دن و رات گم سم رہنے لگتا ہے۔ آنکھوں سے ہر دم آنسو بہتے رہتے ہیں۔ ماں کے غم کا اس کی صحت پر زبردست اثر پڑتا ہے۔

کل تک جس کی دھاڑ سے اچھے اچھوں کی پتلون گیلی ہو جایا کرتی تھی آج وہی لوگ اسے آنکھیں دکھا رہے تھے۔

وہ اس دنیا میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا کیونکہ اول تو اس کی ماں داغ مفارقت دے گئی تھی اور دوم اس نے اب تک شادی بھی نہیں کی تھی۔ وہ اپنا دکھ کسی سے بانٹ بھی نہیں سکتا تھا۔

اسے اس کا علاقہ بھی چھوٹ جانے کا بھی غم نہیں تھا اس سے کہیں زیادہ اسے سر سے ماں کی شفقت والا ہاتھ اٹھ جانے کا ملال تھا۔ وہ خود کو بے بس، لاچار اور مجبور محسوس کر رہا تھا۔

اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ اس کے پاس کچھ تھا تو بس ماں کی یادیں تھیں اور وہ ان یادوں کے سہارے زندگی کے باقی دن گزارنا چاہتا تھا۔

اس پر رنج و غم کے بادل اس قدر چھا گئے تھے کہ مزید جینے کی کوئی چاہ نہیں بچی تھی اور اسی لیے وہ خودکشی کر لینا چاہتا تھا اور اس نے اس کی بارہا کوشش بھی کی مگر ہر بار اس میں وہ ناکام رہا تھا۔

وہ جب بھی اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کا ارادہ کرتا ایک انجانا سا خوف اس کے وجود پر طاری ہو جاتا۔ یہ کوئی اور نہیں بلکہ اس کی ماں کی آتما تھی جو اسے روک دیتی تھی۔ اس کی ماں کا سایہ ان کے سر پر ابھی بھی ہے، ایسا اسکا خیال تھا جو بظاہر دوسروں سے پوشیدہ تھا۔

ایک رات جب وہ سونے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے وہ خواب میں ایک خاتون کو دیکھتا ہے جو سر تا پاؤں سفید لباس میں ملبوس ہوتی ہے۔ اور یہ سراپا اس کی ماں سے مشابہ ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ خواب والی ماں ایک مسلم خاتون کی شرعی لباس میں ہوتی ہے جبکہ اس نے اپنی ماں کو ہمیشہ پوجا پاٹھ ہی میں مصروف دیکھا تھا۔

جیسا کہ وہ بدقماش انسان تھا اور اگر وہ اس خواب کی تعبیر چاہتا تو اسے آسانی سے ورغلایا جا سکتا تھا۔ بانٹنے والے اسے ہندو اور مسلمان کے دو خانوں میں بانٹ سکتے تھے مگر چونکہ اس کے دل میں صرف اور صرف ماں سمائی ہوئی تھی۔

اس کا ماننا تھا کہ ماں تو ماں ہوتی ہے جنم دینے والی، پرورش کرنے والی اور اپنی اولاد پر جان نچھاور کرنے والی۔ اسے شدت سے احساس تھا جب اسکی ماں نے اپنی حیات میں دھرم کا کوئی بھید بھاؤ نہیں رکھا تو پھر وہ۔ ■

E20, Gulshan Colony West Chowbaga
Kolkata-700105

ایک رات جب وہ سونے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے وہ خواب میں ایک خاتون کو دیکھتا ہے جو سر تا پاؤں سفید لباس میں ملبوس ہوتی ہے۔ اور یہ سراپا اس کی ماں سے مشابہ ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ خواب والی ماں ایک مسلم خاتون کی شرعی لباس میں ہوتی ہے جبکہ اس نے اپنی ماں کو ہمیشہ پوجا پاٹھ ہی میں مصروف دیکھا تھا۔

نوٹ: مضامین/ تخلیقات میں ظاہر کی گئی آراء سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔